عبدالمجید سالکؔ

مولانا اکبر حسین الہ آبادی

اکبرؔ کے متعلق بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رجعت پسند تھے۔ اس قسم کی رائے کا اظہار اصول تنقید سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ ہر شاعر اپنے عہد کا نمایندہ ہوتا ہے اور اپنے ماحول اور اپنی معاشرت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اکبرؔ کے زمانے میں صدیوں کا جما ہُوا معاشرہ متزلزل ہو رہا تھا۔ اور جدید خیالات مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور معاشرتی تصوّرات کو بُری طرح جھنجوڑ رہے تھے۔ لیکن ان کی عظیم اکثریت اپنے دین اور اپنی مجلسی اقدار سے گہری وابستگی رکھتی تھی۔ چنانچہ سرسیّد کو اپنے کام میں شدید مشکلات پیش آئیں۔ اور وہ بڑی دشواری سے چند سو انسانوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ ایسی حالت میں اکبرؔ نے اپنی ودیعتِ شاعری سے کام لے کر کچھ عوام کی مالوفات و محبوبات کا احترام کیا۔ کچھ ترقی و ارتقاء کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ایک درمیانی راستہ نکال کر قوم کو مخاطب کرنا شروع کیا۔ بلاشبہ بعض باتیں اُنہوں نے محض برسبیلِ سخن گستری کیں۔ لیکن ان کے کلام کا مجموعی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن ہونے میں افراط و تفریط سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ انقلاب آ چکا ہے۔ ہماری قدیم قدریں پامال ہو رہی ہیں اور نئے معیار قائم ہو رہے ہیں۔ مسلمان شوق سے نئی تعلیم حاصل کریں۔ اور انگریزوں سے ان کی خوبیاں اخذ کریں۔ لیکن اپنے دین اور اپنی مشرقیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ کیونکہ کوّا ہنس کی چال چلے گا۔ تو اپنی چال بھول جائے گا۔ ہر قوم اپنی مذہبی بنیادوں اور معاشرتی خصوصیتوں ہی کی وجہ سے دوسری قوموں میں ممتاز ہو سکتی ہے۔ ان کو ترک کر کے حیات و بقا کی اُمید نہیں رکھ سکتی۔

کہا جاتا ہے کہ اکبرؔ پردہ ترک کر دینے کے مخالف تھے۔ لہٰذا رجعت پسند تھے۔ یہ بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں جن کے باپ دادا اکبرؔ سے بھی زیادہ قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ اور عورتوں کے آنچل کا نظر آ جانا بھی اپنی غیرت مندی کے منافی سمجھتے تھے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ پردہ کا مسئلہ تو اہلِ علم میں بھی اب تک اختلافی مسئلہ ہے۔ خود سرسیّد احمد خاں پردہ ترک کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بلکہ حرّیتِ نسواں کی کسی تحریک کے روادار بھی نہ تھے۔ جب مولوی سیّد ممتاز علی نے اپنی کتاب "حقوقِ نسواں" کا مسودہ سرسید کو دکھایا۔ تو اگرچہ اس کتاب کے مندرجات انتہائی احتیاط لئے ہوئے تھے اور صرف شرعی دلائل کے سہارے پر حقوقِ نسواں کی حمایت کی گئی تھی۔ لیکن سرسید اس مسودے کو پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب سرسری نظر سے اس مسودے کا جائزہ

ے چکے۔ تو انتہائی غیظ کی حالت میں اس کو چاک کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اور مولوی سید ممتاز علی سے کہنے لگے کہ ممتاز علی! ہماری سلطنت گئی۔ ہماری شوکت ختم ہوگئی۔ ہمارے علوم نابود ہوگئے۔ اور تم چاہتے ہو کہ ہماری عورتیں بھی رخصت ہو جائیں جو ہماری نہایت قیمتی متاع ہیں۔ سید ممتاز علی بے حد پریشان ہوئے۔ اُنہوں نے چاک شدہ مسودہ اُٹھایا اور واپس آگئے۔

علامہ اقبال نے عورت کے مسئلے پر جو اشعار لکھے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پردے کے سخت حامی تھے بلکہ عورتوں کی انگریزی تعلیم کے روادار بھی نہ تھے۔ چنانچہ فرمایا

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ان حالات میں کیا کوئی شخص سرسید اور اقبال کو رجعت پسند کہنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایسی باتوں کی بنا پر سرسید اور اقبال رجعت پسند نہیں کہے جاسکتے۔ تو اکبر کو اس قطعے پر کیوں مطعون کیا جاسکتا ہے کہ

کل بے حجاب چند نظر آئیں بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہُوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سرسید بلاشبہ دین اور مشرقیت کے لئے بھی پوری غیرت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی تحریک تعلیم سے نوجوانوں کی جو نئی پود تیار ہوئی اس کی اکثریت ایسی تھی جس کے نزدیک کالج سے نکل کر کسی سرکاری محکمے میں ملازم ہو جانا کوٹ پتلون پہننا، مذہب اور ہر مشرقی چیز پر ناک بھوں چڑھانا ہی ترقی اور روشن خیالی کا تقاضا تھا۔ اس پر اکبر تو اکبر خود سرسید بھی مضطرب تھے۔

اس صورتِ حال پر اکبر کے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا — شیخ و مسجد سے تعلق قطع کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے — بی۔اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اُٹھا تو تھا ولولہ یہ دلمیں کہ صرف یادِ خدا کرینگے — معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے
کہاں کے قبلہ کہاں کے قبلی جنید کیسے کہاں کے شبلی — عوض تصوف کے ہمنے طب لی بنیں گے سرجن مزا کرینگے

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونو مہذب ہیں — حیا ان کو نہیں آتی، انہیں غصہ نہیں آتا

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگ کالج ہو گیا — ذہن کو تپ آ گئی، مذہب کو فالج ہو گیا

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

اکبر خود انگریزی پڑھے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے صاحبزادے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا۔ عمر بھر حکومت انگریزی کے ماتحت ججی کی مرتے دم تک پنشن وصول کی۔ گویا اپنے قول وعمل سے ثابت کر دیا کہ زمانے کے ساتھ چلنا تو ہر حال میں ضرور ہے۔ کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ علومِ حاضرہ کی تحصیل لازمی ہے لیکن مغرب کے کفر و الحاد بے شرمی و بے حیائی، مذہب و معاشرت کے اقدار کی طرف سے بے حسی موت و ہلاکت کا راستہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری قوم کے تعلیم یافتہ حضرات دنیاوی علوم کے حصول میں آسمان کے تارے بن جائیں لیکن خدا کو نہ بھولیں اور اخلاقِ اسلامی کا دامن ہاتھ سے نہ دیں۔ ہماری لڑکیاں اور عورتیں خوب تعلیم حاصل کریں لیکن اسلامی اور مشرقی حیاداری اور انہماک خانہ داری سے کبھی غافل و بے پروانہ ہوں۔ فرماتے ہیں:

مجھ سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

یعنی اسکول کے انہماک کا اثر خانہ داری پر یہ پڑا کہ بیوی تازہ روٹی پکا کر دینا تو درکنار اتنا بتا بھی نہیں سکتیں کہ رات کی بچی ہوئی روٹی کہاں رکھی ہے:

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو — باتیں جو بُری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اسمیں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

تعلیمِ نسواں کے متعلق ارشاد ہُوا ہے:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

پھر فرمایا:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں تو اسپیچ کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں — بُت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

علومِ قدیمہ سے نفرت اور علومِ مغرب سے وابستگی:

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی — بدھوا کڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

جب ہمارے نوجوان ولایت جاکر ولایت جاکر وہاں سے میمیں لانے لگے۔ تو اکبر نے کہا:

ایسا شوق نہ کرنا اکبر — گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا — ہم بھی کالے یار بھی کالا

کمرے میں جو ہنستی ہوئی آئی مس رعنا — ٹیچر نے کہا علم کی آفت ہے تو یہ ہے
پیچیدہ مسائل کے لئے جاتے ہیں انگلینڈ — زلفوں میں اُلجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے

خطا معاف مروں گا میں حور ہی کے لئے — میمیں بھی خوب ہیں لیکن حضور ہی کے لئے

مشرقیت کو مغربیت پر ترجیح:

ہر چند کہ ہے مِس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن — اس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

فرضِ عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید — ہو اگر ضبطِ نظر کی اور خودداری کی قید

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے — مطلب کی کہوں تو پالیسی میں آڑ جائے

باقی ہے سر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش — غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

فرماتے ہیں:

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں پہ اُڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

زور و زر کی اہمیت کے قائل تھے۔ لیکن آدمیت کے لئے مذہب کو ضروری شرط قرار دیتے تھے:

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار — مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

ان روشن حقائق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان پر صرف وہی لوگ ناک بھوں چڑھا سکتے ہیں۔ جو مشرقی اور مسلمان نہیں رہے۔ اور انگریز بن نہیں سکے۔ جن کے نزدیک زندگی صرف توس مکھن انڈے اور شراب و کباب کا نام ہے اور بس۔ یہ نمونے اکبر کے زمانے میں کم تھے۔ اب زیادہ ہیں۔ اور یہی خطرہ تھا جسکی طرف اکبر بار بار توجہ دلاتے تھے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، اکبر نے بہت سی خندہ آور اور قہقہہ انگیز باتیں محض سخن گسترانہ کہی تھیں۔ جن سے اہلِ ملک کو ہنسی ہنسی میں بعض مسائل کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا خصوصاً اوائل میں اکبر کا کلام زیادہ تر اسی قسم کی دلفریب چوٹوں سے معمور ہے۔ ایک دفعہ اکبر نے دو شعر کہے:

اک شیخ نے تعلیم پہ لڑکے کو اُبھارا — اک پیر نے تہذیب سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں یہ تن گیا سائے میں وہ پھیلی — پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

ظاہر ہے کہ یہ سرسید احمد خاں اور مولوی سید ممتاز علی مالک تہذیبِ نسواں پر چوٹ تھی۔ لیکن جب سید ممتاز علی نے اکبر سے شکایت کی۔ تو انہوں نے سید صاحب کو لکھا:

> میں ترقی و تہذیبِ نسواں کا ہرگز مخالف نہیں ہوں۔ جن نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے پرانی نظمیں ہیں جن میں پبلک کے خیالات موزوں کر دئے گئے ہیں۔ میں کیا اور یہ اشعار کیا۔ شعراء قافیہ پیمائی کیا ہی کرتے ہیں۔ دنیا کے قوانین شعر سے نہیں چلتے زمانے کا رنگ زمانے کی ضرورتیں فیصلہ کرتی ہیں اور اس وقت بھی کر رہی ہیں آپ نے صرف چند اشعار کو لے لیا ہے۔ باقی اشعار ملاحظہ فرمائیے تو ان سب باتوں پر نظر کی گئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شعر انقلاب کو روکنے کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ یادگارِ انقلاب ہیں
> ایک شعر میں بھی یہی کہہ چکے ہیں:

شعر اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

اسی طرح سرسید پر ان کی تحریک پر، علی گڑھ والوں پر اکبر کے بے شمار طنزیہ اشعار مشہور ہیں۔ لیکن جب سرسید کا انتقال ہو گیا۔ تو اکبر نے کئی اشعار میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرسید سے بعض امور میں اختلاف کے باوجود وہ مرحوم کی ملت پروری اور دردمندی کے بہت ہی قائل تھے:

واہ اے سیّد پاکیزہ گہر کیا کہنا یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا نہ بھولو فرق ہے جو کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ایک اور غزل کا مطلع ہے:

ہوائے الحاد رنگِ ملّت کو ہر روش پر بدل رہی ہے
جو بات بگڑی بنے وہ کیونکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے

مقطع فرماتے ہیں:

زبانِ اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے رازِ سوزِ حسرت
وہ شمع اس کو بیاں کریگی جو گورِ سیّد پہ جل رہی ہے

اب میں اکبر کے چند طنزیہ اشعار پیش کروں گا۔ جن کی معنویت آج بھی بدستور سلامت ہے۔ مرسید کے چندے پر چوٹ کے ضمن میں دین سے مسلمانوں کی بے توجہی اور پھر ناصاف اور کثیف رہنے کی عادت پر لکھتے ہیں ؎

سید کے یہاں تو چندہ لانے کی ہے ﭽﺦ واعظ کے یہاں بھی پنجگانے کی ہے ﭽﺦ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجے۔ پر اسمیں بھی صبح کے نہانے کی ہے ﭽﺦ

ایک دن کسی نے ذکر کیا کہ فلاں عالم دین نے اپنے لڑکے کو جو حافظ قرآن ہے تعلیم دینی سے ہٹا کر کالج بھیج دیا۔ اکبر اتنے بڑے عالم دین کی دنیا پرستی سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا ؎

سب ہو چلے ہیں اس بتِ کافر ادا کے ساتھ
رہ جائیں گے رسولؐ ہی بس اب خدا کے ساتھ

ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں بے پردگی پر بھی چوٹ ہے۔ اور لیڈری پر بھی :

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

قبر میں نکیرین آئیں گے۔ اور سوال کرینگے کہ تیرا خدا کون ہے اور رسول کون۔ تیرا مذہب کیا ہے۔ لیکن جن لوگوں کا علم حافظے پر نہیں بلکہ محض "نوٹ رکھنے" اور یادداشتیں لکھنے تک محدود ہے۔ ان پر چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

جب نکیرین آئے میری قبر میں بہرِ سوال
میں نے یہ چاہا کہ لکھوا دوں انہیں سب اپنا حال
ہاتھ پاکٹ میں جو ڈالا مجھ کو حیرت ہو گئی
یعنی جو تھی نوٹ بک وہ اس سفر میں کھو گئی
کہہ دیا میں نے کہ میں اب ہر طرح معذور ہوں
رہ گئی دنیا میں میری نوٹ بک مجبور ہوں

اکبر کے زمانے میں "سول سروس" ترقی کی معراج تھی۔ بعد میں تو سول سروس کے ہندوستانی افسر کچھ معزز بھی ہو گئے۔ لیکن اُن ایام میں انگریز انہیں صرف اپنا آلۂ کار سمجھتے اور اُن کی تجدد پسندی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اکبر فرماتے ہیں :

عزیزانِ وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہیں بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

اور یہ شعر تو مشہور ہی ہے :

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

ہندو اور مسلمان دونوں ہی اپنے شعائرِ قومی سے بیزار ہو رہے تھے۔ اکبر نے لکھا :

جب کہا ختنے کو تو لونڈا یہ کہہ کر چل دیا
کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
جب جلیئو کو کہا طفلِ برہمن بول اُٹھا
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

نئی روشنی میں عشق کا فیشن بھی بدل گیا۔ فرماتے ہیں :

آپ کی فرقت میں میں کل رات بھر سویا نہیں
لیکن اتنی بات ہے گاتا رہا رویا نہیں

ایک اور شعر فرمایا ہے :

وصل ہو یا فراق ہو اکبرؔ
جاگنا ساری رات مشکل ہے

خالی خولی تواضع اور محض زبانی جمع خرچ کے متعلق فرماتے ہیں :

بوسہ کیسا کہ گلوری بھی نہیں پاتا ہوں
بس کلام اپنا انہیں جا کے سنا آتا ہوں

وہ یہ کہتے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے واللہ
میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں

بعض وقت تو شیخ وغیرہ پر چوٹ کرتے ہوئے اکبر کی شوخی میں حدود سے تجاوز بھی ہے مثلاً :

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے یہ چوکتا بھی نہیں

شیخ صاحب کو نہیں شاعروں کی بات سے کام
حُسن کی قید نہیں بس ہے مسمات سے کام

دو شعر اور ملاحظہ ہوں :

بی شیخانی بھی ہیں بہت ذی ہوش
کہتی ہیں شیخ سے یہ جوش و خروش

خواہ لنگی ہو خواہ ہو تہمد
در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش

پاکستان کے حکمرانوں، ادیبوں اور اہلِ علم کے لئے کتنی اچھی نصیحت ہے :

اَوروں کی کہی ہوئی جو دُہراتے ہیں
وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں

خود سوچ کے حسبِ حال مضمون نکال
انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

کامل کم ہیں اور اہلِ ارشاد بہت
ساحر تو کم ملیں گے میّاد بہت

ہر بزمِ سخن کا حال یہ ہے اکبرؔ
شاعر کم ہیں مگر ہیں اُستاد بہت

اکبر کو اپنے زمانے کی رفتار اور معاشرے کے انقلاب کے اثرات صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے آج سے چالیس پنتالیس سال پہلے پیش گوئی کی۔ اس کو سنئے۔ اور انصاف سے کہئے آیا اس پیش گوئی کا ایک ایک حرف پورا نہیں ہوا ؟

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے

بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پُتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہونگے، اس لئے بے تال و سم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا میں ضم ہونگے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب کے کم ہونگے

کسی کو اس تغیّر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

مُسلم ثقافت ہندوستان میں

مصنّفہ عبد المجید سالک

اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدّت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔

صفحات ۷۳۵ - قیمت -/۱۲ روپے

—— ملنے کا پتہ ——

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ - کلب روڈ - لاہور